فرح سیّد ❁
ڈاکٹر ذکیہ رانی ❁❁

بلوچستان کی اردو شاعری پر ترقی پسند تحریک کے اثرات

Impacts of Progressive Movement on Urdu poetry of Balochistan

By *Farah Syed, Research Scholar, Dept. of Urdu, University of Karachi.*
Dr. Zakia Rani, Asst. Prof., Dept. of Urdu, University of Karachi.

ABSTRACT

The tradition of Urdu poetry in Balochistan was nurtured in the shadow of northern and southern Hindustan. Until a decade of the twentieth century, the impacts of contemporary inclinations and movements, especially that of the Progressive Movement, on the Urdu poetry of Balochistan can be identified clearly. The poets belonging to the Progressive Movement unified the Balochs against exploitation and injustice. Representing the political and social issues besides the civilization of Balochistan, these poets interpreted the public sentiments in their works at the local and international levels. They had been presenting their thoughts and theories in the form of verses against the colonialism before the partition and their exploitation and governance on the basis of injustice after the divide. In this paper, the impacts of the Progressive Movement on the Urdu poetry of Balochistan have been analysed at the research level.

Keywords: Balochistan, Urdu Poetry, Progressive Movement, Civilization, Colonialism, Exploitation.

❁ ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ کراچی۔
❁❁ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ کراچی۔

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

مغلیہ دور میں ادب کو یہ مقام کبھی نہیں ملا کہ وہ قوم کے اجتماعی معاملات میں دخل اندازی کرے اس وقت ادب کے صرف دو بنیادی مقاصد تھے۔اوّل ذہنی تسکین اور ذوق اشتہا کومہمیز کرنا جس میں مادیت اور مقصدیت کم سے کم تھی اُس وقت اردو شاعری ایک ایسا فن تھا جس میں بادشاہوں کی شان میں قصیدے پڑھ کر دادو نذرانے سمیٹے جاتے تھے۔[۱] دوم، اظہارِ بیان کی مہارت اور شائستہ اسلوب کا اظہار کیا جاتا ہے۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> اس حقیقت کی تردید نہیں ہوسکتی کہ پرانے ادب کی کوئی نظم......کوئی ایک نظم بھی اس اجتماعی احساس اوراس عمرانی ادراک کی حامل نہیں جومثلاً حالی کی مسدس یا شبلی کی بعض سیاسی نظموں میں پایا جاتا ہے۔[۲]

جبکہ بلوچستان میں صورت حال یہ تھی کہ یہاں قبائلی اور جاگیردارانہ دور کی شاعری نوابوں، سرداروں، میروں اور خوانین میں خوشی اور مسرت فراہم کرنے کا ذریعہ تھی۔

جس وقت سر سید احمد خان اردو کی ناؤ کو مقصدیت کے کنارے لگانے کی تگ و دو میں مصروف تھے اُسی عہد میں بلوچستان کی سرزمین پر زیب مگسی اور اُن کے ہم عصر شعرا و ادبا اردو کی آبیاری کر رہے تھے۔

زیب مگسی کی شاعری میں قدیم وجدید کا سنگم کروٹیں لیتا نظر آتا ہے۔سر سیّد کی ادبی تحریک کے زیر اثر بلوچستان کی اردو شاعری کے اسلوب میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور اس کے نتیجے میں اردو شاعری قدامت کے چنگل سے آزاد ہوکر زندگی کی حقیقی فضا میں سانس لینے لگی۔

انور سدید کے مطابق ہر ادبی تحریک سب سے پہلے مقامی اسلوب میں مسلسل تبدل وتغیر پیدا کرتی ہے۔زبان کے ذخیرۂ الفاظ کو چھان پھٹک کر اُسے نکھارتی ہے۔قدیم اور گھسے پٹے الفاظ کو ترک کر کے نئے الفاظ کا انتخاب، ترکیبوں کے تنوع اور بندشوں کے علاوہ تشبیہات و استعارات کا ایک نیا ذخیرہ دریافت کرتی ہے۔ادبا و شعرا لفظوں کو نئی معنویت فراہم کرتے ہیں اور یوں معنویت کو وہ سانچہ میسر آجاتا ہے جس میں اس کی تمام جہتیں سما جاتی ہیں۔اس طرح شاعری سماج میں جلد قبول عام حاصل کر لیتی ہے اوراس مقام پر ادب کو نہ پرانے معیار پر جانچا جاسکتا ہے اور نہ قدیم رجحانات میں اس کو سمویا جا سکتا ہے۔[۳] بلوچستان کی اُردو شاعری انیسویں صدی میں اپنے تعمیری وتشکیلی مراحل سے گزرنے کے بعد فارسی زبان وادب کے زیر اثر برصغیر کے دبستانوں (لکھنویت اور دہلویت) کے سائے میں پروان چڑھتی ہوئی اپنے روایتی انداز اور اسلوب کے ساتھ بیسویں صدی میں مزید ارتقائی مدارج طے کرتی ہے تو بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اردو شاعری برطانوی سامراج کے مقابل

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

بلوچستان کے علاقے لورالائی اور پھر کوئٹہ میں بڑی شان کے ساتھ جلوہ فگن ہوتی ہے۔ جہاں ۱۹۱۱ء میں سردار محمد یوسف پوپلزئی، عابد شاہ عابد، فتح چند نسیم باقاعدہ مشاعروں کی ابتدا کرتے ہیں اور طرحی مشاعروں کے اجرا میں باقاعدگی آجاتی ہے۔ اس طرح اُردو شاعری عوامی سطح پر متعارف ہوتی ہے۔ جس کا سہرا اِن ہی حضرات کے سر جاتا ہے۔ یہ دور اس حوالے سے بھی تاریخ ساز کہلائے گا کہ اِن ہی کی کوششوں سے اُردو زبان کا پہلا رسالہ ''قندیلِ خیال'' جاری ہوا اور کلی کرانی کے سیّد عابد شاہ عابد کا پہلا مجموعۂ کلام ''گلزارِ عابد'' جو بلوچستان میں کسی شاعر کا پہلا مجموعۂ کلام ہے شائع ہوا۔(۴)

علی گڑھ تحریک نے قومی سطح پر جو تحریک پیدا کی تھی اس سے قدیم معیارات اور رجحانات پر کاری ضرب لگی اور انگریزی علوم و تہذیب سے مطابقت پیدا ہوئی اور انیسویں صدی کے آخر میں اسی تحریک کی بدولت ادب اور زندگی نئی جہتوں سے آراستہ ہوئی اور جدیدت کے افق پر حقیقت پسندی کا سورج طلوع ہوا جس کے نتیجے میں ادب داخلیت کی کارفرمائیوں اور جذب و تخیل سے دور ہو گیا۔(۵)

اس باب میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ کہتے ہیں کہ:

> باعزت، باقاعدہ اور بھرپور زندگی بسر کرنے کے لیے جس تہذیب، ذہن و شعور کی ضرورت تھی اس کی تعمیر میں سر سیّد تحریک نے نمایاں اور غیر معمولی حصّہ لیا اور آنے والی سب ادبی اور فکری تحریکیں اِس کی احسان مند ہیں۔(۶)

علی گڑھ تحریک کے تحت نا صرف اُردو زبان کو وسعت ملی بلکہ اُردو ادب کے اسالیب اور روحِ معانی بھی متاثر ہوئی۔(۷)

اِس تحریک نے زندگی کی جمالیات کو فروغ دینے کے بجائے افادیت کی طرف مائل کیا اور یہ ثابت کیا کہ شاعری مادی زندگی کو بدلنے اور اسے ارتقا کی طرف مائل کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے اور یہ ہی نظریہ بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک کا محرک ثابت ہوا لہٰذا علی گڑھ تحریک نے ہی اولین بنیادوں پر اُردو زبان کے دورِ طفلی میں ہی اس کی اہمیت و افادیت کو سمجھ اور پرکھ لیا تھا اور اسے زندگی کا آئینہ بنا دیا تھا۔(۸)

اس لحاظ سے بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> سر سید احمد خان سب سے پہلے ترقی پسند ادیب اور نقاد تھے۔(۹)

حالؔی کی ''مقدمۂ شعر و شاعری'' علی گڑھ تحریک کے لیے بوطیقا ثابت ہوئی اس کا عملی اظہار ''یادگارِ غالب'' میں ہوا اور اِن نظریات کی عملی تقلید شبلؔی کی ''شعر العجم'' سے ہوئی۔ سر سید احمد خان کے نزدیک موضوع اور بنیادی

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

مضمون اہمیت رکھتا ہے نہ کہ اسے تصنع، بناوٹ اور تکلفات سے علامات اور تشبیہات سے لپیٹ کر پیش کیا جائے بلکہ صحیح معنی مفہوم کے ساتھ اس طرح پیش کیا جائے کہ قاری کے دل و دماغ میں اتر جائے۔(۱۰)

سر سیّد اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> تُک بندی سے جو اس زمانے میں مقفّیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا جہاں تک ہوسکا سادگئ عبارت پر توجہ دی اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ مضمون کی ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔(۱۱)

سر سید نے غزل کی منتشر خیالی سے نالاں ہو کر نظم رائج کرنے کی ہدایت کرتے ہیں:

> ہماری زبان کے علم و ادب میں بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمت، عاشقانہ غزلوں، واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور ہجر کے قطعوں و قصہ کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔(۱۲)

اِس نظریے کے تحت اُنہوں نے حالؔی سے مسدس مدوجزر اسلام لکھوائی سر سید کی جدیدیت یہ تھی کہ نظم میں ردیف و قافیہ کی پابندی سے خیالات عمدگی سے بیان نہیں کیے جا سکتے تھے چناں چہ انھوں نے آزاد نظم کا تصور پیش کیا۔(۱۳)

> ردیف وقافیہ کی پابندی گویا ذاتِ شعر میں داخل تھی رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج نہیں تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا اِن باتوں کے نہ ہونے سے ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی۔(۱۴)

چناں چہ دبستانِ سرسید نے اردو شاعری کے مزاج میں مادیت ومقصدیت کوٹ کوٹ کے بھر دی اور شعرا کو قومی تقاضے پورے کرنے کی تربیت دی۔ ان کے خیال میں غزل اپنی ہیئت کی وجہ سے قومی اور مادی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ناکافی تھی اس لیے نظم اور نظم کی ہیئت پر زور دیا گیا۔ ان ہی مقاصد کے حصول کے لیے انجمن پنجاب کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ ہی نہیں قدیم مشرقی علوم کا احیا دیسی زبانوں کے ذریعے، علوم مفیدہ کی ترویج صوبائی ربط و تعلق اور علمی و ادبی معاشرتی موضوعات پر مباحثے اس کے منشور میں شامل تھے۔ اس کے تحت نظموں کے موضوعات پر مشاعرے منعقد کیے جاتے تھے جو عوام میں بہت مقبول ہوئے۔ ان مشاعروں کے روحِ رواں حالؔی اور آزاد تھے جنھوں نے نئے شعرا کے لیے راہیں ہموار کرنے میں رہنما کا کردار ادا کیا۔(۱۵)

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

سر سید نے ادب کا جو نظریہ پیش کیا تھا وہ زندگی اور معاشرے سے مطابقت رکھتا تھا وہ چاہتے تھے کہ مسلمان وہ علوم سیکھیں جن کے ذریعے انگریزوں کے نظم ونسق میں شامل ہوا جا سکے۔ان کے تسلط سے محفوظ رہنے کی اور کوئی صورت نہیں سوائے اس کے کہ اُن کے علوم کو سیکھ کر جز وِ حکومت بن جائیں۔(۱۶) اِس تصور کو عام کرنے کے لیے شعرا و ادبا اپنا کردار ادا کریں چناں چہ بلوچستان میں اِس نظریے کے تحت دو صورتیں ایک سیاسی سطح اور دوسری علمی و ادبی سطح پر سامنے آگئیں۔ یہاں انگریزوں کے خلاف مجاہدانہ سرگرمیاں انھی دو صورتوں میں اجاگر ہوئیں۔ اِن دونوں صورتوں کی رہنمائی یوسف علی خان مگسی، میر محمد حسین عنقا اور میر گل خان نصیر وغیرہ کے حصے میں آئی۔ یہ تینوں شعرا سر سید کے خیالات، نظریات اور اصطلاحات، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان اور مولانا محمد علی جوہر کے افکار، شاعری اور سیاسی نظریات سے اثر پذیر ہوئے تھے۔(۱۷)

یوسف عزیز جو بلوچستان میں ادبی و سیاسی بیداری کے علمبردار اور قائد تھے۔مولانا ظفر علی خان اُن کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تم کو خفی عزیز ہے ہم کو جلی عزیز — عارض کا گُل تمھیں، ہمیں دل کی کلی عزیز
لفظ بلوچ مہر و وفا کا کلام ہے — معنی ہیں اِس کلام کے یوسف علی عزیز(۱۸)

بیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائیاں بلوچستان میں ایک انقلابی دور کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد قدیم وجدید کی کشمکش کا دور شروع ہوتا ہے اور یہ ہی وہ وقت تھا جب بلوچستان میں اُردو شاعری کے ذریعے تحریک آزادی کو پروان چڑھانے اور فروغ دینے کا یہ عظیم عمل نواب عزیز مگسی اور اُن کے رفقا نے انجام دیا اور اُردو شاعروں کو مشاعروں، ادبی مباحثوں اور ادبی نشستوں کے ذریعے عوامی سطح پر پہنچایا اِن محافل میں نا صرف سرکاری ملازمین، طلبہ اور بلوچستان کے پڑھے لکھے طبقے کی کثیر تعداد شریک ہوتی تھی۔(۱۹) ہر محفل میں صدارت کے لیے اور اس کے علاوہ بھی جیّد شعرا و ادبا اور ملک کی معروف شخصیات کو مدعو کیا جاتا تھا۔ اِن محافل میں حفیظ جالندھری، احسان دانش، شیخ عبدالقادر، ساغر نظامی، وقار انبالوی اور عبدالمجید سالک وغیرہ کی شرکت کا سراغ ملتا ہے۔

شیخ عبد القادر کے پیشِ نظر اگر چہ کوئی سیاسی مقصد نہیں تھا اُنھوں نے اپنے مجلّے ''مخزن'' کے ذریعے اس نظریے کو پروان چڑھایا جس کا نصب العین اُردو زبان کی نشوونما اور اسے تہذیبی اور ثقافتی سطح پر وسعت دینا تھا۔(۲۰) جب اس کے اثر وعمل کا دائرہ پھیلا تو اس نے نا صرف ہندوستان کی علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی کو متاثر کیا بلکہ بلوچستان کی ادبی فضا کو بھی اس تحریک نے بے پناہ توانائی فراہم کی۔ رسالہ مخزن کے صفحات سے ایسے متعدد ادیب ابھرے جنھوں نے رومانی تصورات کے ذریعے قوت متخیلہ کو لطافت سے آشنا کیا۔ ان میں علامہ اقبال،

جوش ملیح آبادی، مولانا ظفر علی خان، ابوالکلام آزاد، حفیظ جالندھری، نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر یلدرم قابلِ ذکر ہیں۔ (۲۱)

سیّد عبداللہ کے بقول:

''مخزن'' ہی میں پہلی دفعہ انسان نے انسان کو ڈھونڈا اور انسان نے اپنے اندر کے انسان سے ملاقات کی اور زندگی کی اِن شرافتوں کا احساس زندہ ہوا جن سے انسانوں کی بستی بسنے کے قابل ہوتی ہے... ''مخزن'' نے ادب کی روح میں بڑی تبدیلی پیدا کی مخزن کے ادیب خاموش فکر کے علمبر دار تھے اور اگر ملک کے سیاسی حالات ملک میں ذہنی ہیجان اور جذباتی جوش و خروش پیدا نہ کر دیتے تو یقیناً ''مخزن'' کی تحریک اُردو ادب میں جذباتی تسکین، ادبی طہارت اور فکری توازن کے رجحانات کے لیے بڑی تقویت کا باعث ہوتی۔ (۲۲)

ترقی پسند تحریک کا آغاز تو ۱۹۳۶ء میں ہوا جس کی پہلی کُل ہند کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ (۲۳) لیکن اس سے بہت پہلے بلوچستان میں بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے ہی شاعری میں مزاحمت کی ہلکی ہلکی آنچ لو دینے لگی تھی ادب پر حقیقت پسندی غالب آ چکی تھی۔ اس طرح اردو شاعری عصری آگہی کے تحت سیاسی اور سماجی شعور کا حصہ بنتی جا رہی تھی اور مولانا الطاف حسین حالیؔ، محمد حسین آزادؔ، مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبال کے افکار سے اپنا حصّہ کشید کر رہی تھی کیوں کہ اس وقت ہندوستان کے تمام دانش ور اور شعرا برطانوی سامراج کے خلاف تحریکِ آزادی کی جدوجہد میں متحد ہو چکے تھے اور روس کے اشتراکی انقلاب نے مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کے استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ (۲۴)

بلوچ رہنماؤں اور شعرا نے اپنی جدوجہدِ آزادی کی عملی اخلاقی حمایت کے لیے ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں اور قائدین سے رابطے قائم کیے تھے۔ یوسف عزیز مگسی وہ پہلے بلوچستانی رہنما تھے جو علامہ اقبال سے ملے اور اپنے دیگر سیاسی ساتھیوں سے متعارف کروانے کے ساتھ ساتھ بلوچستان کے سیاسی حالات اور سماجی مسائل پر بھی تبادلۂ خیال اور اُن سے مسلسل رہنمائی حاصل کرتے رہے اور مختلف ملاقاتوں میں اُن کے افکار و نظریات سے بھی استفادہ کیا۔ (۲۵)

ہندوستان سے مختلف رہنماؤں کا بلوچستان آنے کا سراغ ملتا ہے مولانا ظفر علی خان ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں یہاں آئے تھے اور فرمایا تھا کہ مجھے اِس بات کی خوشی ہے کہ برصغیر میں انگریز تسلط کے خلاف جو تحریکِ آزادی کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ بلوچستان بھی اس میں سیاسی اور ادبی سطح پر شدت اور اخلاص کے ساتھ اپنا

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کردار ادا کر رہا ہے اور یہاں جوش و جذبے کے ساتھ احتجاج کی لہریں بھی پھوٹ رہی ہیں۔ مولانا ظفر علی خان کی یہ نظم بلوچستان کے عوام کے لیے فخر کا باعث ہے۔[۲۶]

مردانِ مجاہد ہیں گردانِ بلوچستان دبتے نہیں باطل سے شیرانِ بلوچستان
جس وقت سے قاسم نے گاڑا ہے یہاں جھنڈا لغزش میں نہیں آیا ایمانِ بلوچستان
کیا لائیں گے خاطر میں خم خانۂ لندن کو مست مئے یثرب ہیں رندانِ بلوچستان
خوں شہ رگ بطحا سے پہنچا جو یہاں بہہ کر گل رنگ ابھی تک ہے میدانِ بلوچستان
آزادیٔ کامل پر حق ہے بدوّیت کا اور یہ بدوّیت ہے سامانِ بلوچستان
وہ وقت بھی آتا ہے دیکھو گے ان آنکھوں سے داراو سکندر کو دربانِ بلوچستان
ہے ذوقِ سخن جن کو، سن کر اِسے کہہ دیں گے یہ نظم مرصع تھی شایانِ بلوچستان[۲۷]

ڈاکٹر آغا محمد ناصر کا کہنا ہے تحریکِ آزادی کے دوران مولانا ظفر علی خان کے علاوہ علامہ اقبال، مولانا الطاف حسین حالؔی، حفیظ جالندھری اور احسان دانش نے خاص طور پر اہلِ بلوچستان کو متاثر کیا اور اِس سرزمین پر اُن کے اشعار زبان زدِ خاص و عام ہو گئے۔

علامہ اقبال پانچ مرتبہ بلوچستان آئے۔[۲۸] اقبالؔ نے اپنی شاعری میں مسلمانوں کو آزادیٔ وطن کا درس دیا اور پھر اس جدوجہد کو تیز کرنے کے لیے انھوں نے کبھی افغانوں کو کبھی ترک اقوام کو اور کبھی عرب اقوام کو مخاطب کیا اس طرح سنگلاخ وادیوں میں سانس لینے والی قوم بلوچستان کو بھی مخاطب کیا۔ اِس کے پس منظر میں رشید احمد خان لغاری یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ''علامہ اقبال عالمِ شباب میں اُن کے دادا مرحوم سر خان لغاری سے ڈیرہ اسماعیل خان ملاقات کے لیے گئے۔ لغاری ہاؤس میں قیام کے دوران علامہ اقبال نے بلوچ معززین کو اپنی رومانوی شاعری سنائی اُن کو یہ رومانوی رجحان پسند نہ آیا اُنہوں نے اقبال کو یہ نصیحت فرمائی کہ اگر شاعری کا شوق رکھتے ہو تو قوم کے دلوں میں غیرت وحمیت کے جذبات پیدا کرو۔ مثنوی مولانا روم عنایت فرمائی اور کہا اُس سے رہنمائی حاصل کرو''[۲۹] اس واقعے کے کچھ عرصے کے بعد ۱۹۳۳ء میں اِس نصیحت کا اعادہ اس طرح ہوا کہ نواب یوسف علی عزیز مگسی کے سیاسی رفیق میر عبدالعزیز کُرد نے علامہ اقبال سے ملاقات کی اور بلوچستان کی سیاسی صورت حال بیان کرنے کے بعد انھوں نے بلوچ قوم کے لیے نظم لکھنے کی درخواست کی کہ بلوچوں کے نام بھی کوئی پیغام پہنچائیں تاکہ وہ بھی کچھ فیض حاصل کر سکیں کچھ عرصے کے بعد اُن کی یہ نظم ''بڈھے بلوچ کی نصیحت اپنے بیٹے کو'' اُن کے آخری شعری مجموعے ''ارمغانِ حجاز'' میں شائع ہوئی۔[۳۰]

ISSN: 2519-6332 (Print),   ISSN: 2708-1915 (Online)

''بڑھے بلوچ کی نصیحت اپنے بیٹے کو''

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا   اِس دشت سے بہتر ہے نہ دلّی نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل   وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں   پہناتی ہیں درویش کو تاجِ سرِ دارا
حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کو   کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر   ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارا
محروم رہا دولت دریا سے وہ غواص   کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا
دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت   ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا
دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح وبدن پیش   تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پا مردیٔ مومن پہ بھروسا   ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
تقدیرِ امم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا   مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا
اخلاصِ عمل مانگ نیا گان کُہن سے   شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا!(۳۱)

بلوچستان کے شعرا کو ایک نسخۂ کیمیا ہاتھ آ گیا تھا۔ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں تحریک آزادی کے زور پکڑنے کے ساتھ ہی انگریز کے نو آبادیاتی نظام کے خلاف زبردست جدوجہد شروع ہوگئی۔ بلوچستان کے زیادہ تر ادبا اور شعرا سیاست سے براہِ راست تعلق رکھتے تھے اور سرکار کے ملازم تھے اِسی سبب سے ادب کا سیاست سے براہ راست تعلق قائم ہوا۔

اِسی کے نتیجے میں مزاحمتی شاعری کا رجحان پیدا ہوا کیوں کہ مزاحمتی ادب اِس جگہ اپنا مقام بناتا ہے جہاں سماج دو حصوں ظالم اور مظلوم کے درمیان منقسم ہوتا ہے۔ جہاں سامراج کا تسلط، سرمایہ دارانہ نظام یعنی طبقاتی نظام کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔ جہاں عوام کی بنیادی ضروریات کا استحصال کیا جاتا ہے اِس صورت حال پر قابو پانے کے لیے معاشرے کے شاعر، ادیب اور دانشور اِن مظالم اور نا انصافیوں کے خلاف بھرپور آواز حق بلند کرتے ہیں۔ مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والوں کے خلاف ہر طرح کی رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں اُنہیں کبھی پابندِ سلاسل کیا جاتا ہے کبھی جلاوطنی کی سزائیں دی جاتی ہیں کبھی زنداں میں محبوس کر دیا جاتا ہے لیکن آزادی کے متوالوں کی جدوجہد فزوں تر ہوتی چلی جاتی ہے(۳۲) یوسف عزیز مگسی نے جلاوطنی کے وقت لندن جاتے ہوئے یہ الوداعی شعر اہل بلوچستان کے نام کیا تھا۔

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کِلیسا ابھی(۳۳)

قوم کا درد سینے میں دبا کر جانے والا عزیز مگسی قاہرہ پہنچ کر اپنی ایک معرکۃ الآرا نظم ''اپنی خوشی سے آپ ہوا ہوں جلا وطن'' کہتا ہے جس میں غیرت اور دلیری جھلکتی ہے(۳۴) جب وہ اقبال کے رنگ میں اِس بات کا عزم کرتے ہیں تو کلام کا یہ اسلوب ہوتا ہے:

سبق دے کر اخوت کا شجاعت کا،محبت کا
میں پھر بلوچستان کی بگڑی بنوا کر چھوڑوں گا(۳۵)

سامراج کے خلاف مزاحمتی تحریک چلتی ہے یہی مزاحمتی رنگ سردار محمد یوسف خان پوپلزئی کے یہاں بھی کارفرما ہے۔

شمشیر بلوچی ٹوٹ گئی تو اِس قدر دلشاد نہ ہو
وہ ہوش نہیں وہ جوش تو ہے دو ہاتھ تو ہیں کمزور سہی(۳۶)

مزاحمتی شاعری اس تحریک کا حصہ ہوتی ہے جو مظلوم عوام کے لیے اُمیدوں کا چراغ روشن کرتی ہے۔انقلابی اور مزاحمتی شاعری کی انتہا اقبالؔ پر ہوتی ہے(۳۷) جس سے متاثر ہوکر بلوچستان کے شاعروں نے مزاحمتی شاعری کے ذریعے اپنی عوام کو سیاسی شعور بخشا۔علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، مولانا ظفر علی خان، حالیؔ اور فیضؔ اِس تحریک کے سرخیل تھے۔اقبال کے نزدیک حقیقی انقلاب وہی ہے جو معاشرے کے سوا وجدانی بھی ہو اِسی وجدانی انقلاب سے من کی دنیا آزاد ہوگی من کی دنیا اصل انسانیت کی دنیا ہے لیکن جہاں کوئی غلام بنا اور اپنا سر جھکا دیا تو من کی دنیا باقی نہیں رہتی رہی تن کی دنیا تو وہ معاشی سامراج کی دنیا ہے۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن(۳۸)

لیکن یہ وجدانی حقیقت بھوک کا قلع قمع نہیں کر سکتی سماجی انصاف اور انتقام کی اِس سے زیادہ پُرشور تعلیم کیا ہوگی کہ وہ اِس یقین کے ساتھ کہتے ہیں:

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقین سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی — اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو(۳۹)

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

اقبالؔ کے شامل ہونے سے بلوچستان کی مزاحمتی شاعری تنہا نہ رہی بلکہ یہ مزاحمتی تحریک کا حصہ بن گئی۔گل خان نصیر کے اِس شعر کے مطابق:

بلوچی زندگی کی شان پھر دنیا کو دکھلا دے
بتا دے اُن کو کر سکتی ہے کیا یہ قوم صحرائی(۴۰)

یہ وہی تحریک ہے جو مظلوم اور استحصالی نظام کے خلاف اپنے حقوق کی فراہمی کے لیے برسرِ پیکار رہتی ہے جو سرگرم اور باعمل شعرا کے جذبات میں تلاطم پیدا کرتی ہے۔یہ تحریکِ آزادی کی جدوجہد سے پیدا ہونے والے تمام خدشات،توہمات اور نا اُمیدی کی کیفیات میں ثابت قدم رہتی ہے اور یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا درس دیتی ہوئی روشن مستقبل کے خوش آئند پیغامات کو دل میں اتار دیتی ہے یہ ہی وجہ ہے کہ اِس مزاحمتی شاعری نے برطانوی سامراج،غدار سرداروں اور سرمایہ داروں کو ہمیشہ خوف زدہ رکھا اُن کے لیے اسلحے سے زیادہ ضرررساں وہ انقلاب پرور نغمے اور گیت تھے جو اِن غاصبوں کے دلوں کو زیر و زبر کر کے رکھ دیتے تھے یہ ہی ڈر و خوف تھا جس کے زیر اثر ذرائع ابلاغ پر پابندی لگائی جاتی ہے تو کبھی تشدد کا راستہ اپنایا جاتا ہے لیکن انقلابی لہروں کو دبایا تو جا سکتا ہے روکا نہیں جا سکتا۔اس منظر نامے نے ترقی پسند خیالات کو تقویت فراہم کی چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ اِس مزاحمتی اور فکری تحریک نے علمی،ادبی،سیاسی اور سماجی میدان میں وہ مثبت تبدیلیاں پیدا کیں جس نے فکر و شعور کی شمعیں جلا دیتے ہوئے عوام کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔لال بخش رند اپنے مضمون ''میر گل خان نصیر،شاعرِ انقلاب'' میں کہتے ہیں کہ:

> میر گل خان کی وہ شاعری جو بلوچستان کے لیے اس زمانے میں کی گئی جبکہ بلوچستان کے حالات رگرگوں تھے یا اس وقت جب وہ قید و بند کی صعوبتوں کو جھیل رہے تھے۔اس وقت کی شاعری میں خصوصیت سے مزاحمتی و انقلابی رنگ شدت کے ساتھ نظر آتا ہے۔

میر گل خان نصیر خود کہتے ہیں کہ:

> بم،توپ،گولہ بارود،جنگ،بمباری وغیرہ میری شاعری کے موضوعات اِس لیے ہیں کہ میرا واسطہ زندگی بھر گولہ بارود،جیل،بمباری،لاک آپ اور پولیس تشدد سے رہا ہے مجھے زندگی نے ایسا موقع دیا ہی نہیں کہ میں گل و بلبل،شمع پروانہ اور عیش و مستی کی شاعری کروں۔(۴۱)

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

میر گل خان نصیر اپنے شعری مجموعے ''گرئند'' کے پیش لفظ میں ادب اور سماجی زندگی کی اِسی صورتحال کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ہم سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ کون سی شاعری اچھی ہے آیا وہی جو ملک وقوم و سماج اور سماجی زندگی کی آئینہ دار ہو یا وہی جو صرف زبان کی لذت و چاشنی اور الفاظ کی شان وشوکت اور اُس کی ترقی کے بارے میں ہو دوسرے لفظوں میں اِسے ادب برائے ادب کی شاعری بھی کہا جا سکتا ہے جو محض زبان کی لذت اور چاشنی کی شاعری ہے اور میرے نزدیک یہ صرف وقت گزاری اور دولت مندوں کے دل بہلانے کے ایک ذریعے کے سوا اور کسی اہمیت کی حامل نہیں ہے اِس لیے ادب برائے ادب کے نظریے کو میں نہیں مانتا حقیقی معنوں میں وہی ادب، ادب کہلانے کا مستحق ہے جو زندگی کی جنگ میں عوام کا مددومعاون ہو۔اگر عوام بھوکے، ننگے اور غلام ہیں تو زبان کی چاشنی،فصاحت و بلاغت،شاعر کی رنگیں بیانی اورتعریف و ستائش جیسی چیزیں ممکن ہے کہ ایک لمحے کے لیےعوام کوخواب کی پُرکیف آغوش میں لے سکیں لیکن اُن کے ننگے بدن اور خالی پیٹ کا مداوا بہرطورنہیں بن سکتے ہمیں یادرکھنا چاہیے کہ زبان لوگوں کے درمیان ابلاغ کا ایک وسیلہ ہے کہ جس کی مدد سے ہم اپنی قوم، سماج، سماجی ضرورتوں اور تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک خوشحال معاشرے کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں بجائے خود زبان ہماری مرادو منزل نہیں بلکہ یہ ہماری قومی امنگوں کے حصول اور منزل تک پہنچنے کے وسیلوں میں سے ایک وسیلہ ہے۔ہمیں چاہیے کہ ہم ایسا ادب تخلیق کریں کہ جس سے ہم خاک نشینوں کو ایک باوقار زندگی گزارنے کے قابل بنا سکیں... میرے نزدیک ایک ادب کی بنیادی تعریف یہی ہے باقی بعد کی چیزیں ہیں۔ (۴۲)

اِس اقتباس کے مطالعے سے واضح ہوا کہ وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔نصیر،فیض اور شیخ ایاز سے گہرے تعلقات رکھتے تھے وہ سردار جعفری کی شاعری کے مداح تھے انھوں نے جوش ملیح آبادی کے مجموعے''شعلۂ وشبنم'' کی جنوں خیزی سے بھی اثر قبول کیا تھا۔(۴۳) ترقی پسند ادبی نظریے کی بنیاد بھی اِسی پر ہے کہ ایک ادیب،شاعر یا فن کار سماج میں رہنے والے ایک فرد کی حیثیت سے ذاتی واجتماعی زندگی کی ذمے داریوں اور

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

تقاضوں سے منہ نہیں موڑتے۔ادب بھی زندگی ہی کا ایک شعبہ ہے اِس لیے ادب کے تقاضے زندگی کے تقاضوں سے الگ نہیں ہو سکتے اور جو ادیب و شاعر ادب کو زندگی کے تقاضوں سے الگ ہو کر دیکھتے ہیں تو اُن کا یہ عمل ادب اور تہذیب کی مجموعی ترقی میں رکاوٹ بنتا ہے کیوں کہ ادب اُسی وقت زندہ رہ سکتا ہے اور ترقی کر سکتا ہے جبکہ وہ جمہوری اور معاشرتی زندگی کی توسیع ترقی میں مددگار ثابت ہو۔[۴۴] ادب کا معاشرے سے بھی گہرا تعلق ثابت ہوتا ہے اور ادیب اور معاشرہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اس لیے ادیب اپنے معاشرے کے مسائل سے فرار حاصل نہیں کر سکتا ادیب اپنے خیالات و نظریات و افکار کے اظہار میں آزاد ہے مگر اسے معاشرے کے احساسات، مسائل، حالات و واقعات پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔جو ادیب اس کا خیال نہ رکھے وہ معاشرے کا باغی ہے۔سچا ادیب اپنے جذبات کی نہیں اپنے ماحول کی بھی ترجمانی کرتا ہے۔اس کی زبان سے اجتماعی انسانیت کے فقرے نکلتے ہیں۔[۴۵] بلوچستان کے شعرا بھی معاشرے کے باغی نہیں تھے وہ اس نظام کے باغی تھے جو کہ اُن پر مسلط کر دیا گیا تھا۔اختر حسین رائے پوری کے مقالے ۱۹۳۴ء کے ''ادب اور زندگی'' کے نظریے کا فعال کردار ترقی پسند تحریک میں ابھرتا ہے جس سے اس نظریے کو بھرپور تقویت ملی۔انجمن کا پہلا منشور لاہور میں مرتب ہوا اور اِسے ڈاکٹر سجاد ظہیر، فیض احمد فیضؔ اور صوفی تبسم نے ابتدائی شکل دی تھی۔جس میں منشی پریم چند کا صدارتی خطبہ سند کی حیثیت اختیار کر گیا جس میں کہا گیا تھا کہ:

> جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے ہم میں قوت اور حرکت بیدار نہ ہو ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال پیدا نہ کرے وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔اِس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ادب آرٹسٹ کے روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے۔تخریب نہیں... ادب ہماری زندگی کو فطری اور آزاد بناتا ہے... اِس بدولت نفس کی تہذیب ہوتی ہے یہ اِس کا مقصد اولیٰ ہے۔[۴۶]

منشی پریم چند نے اِس نظریے کے ذریعے داخلیت اور خارجیت کے درمیان ایک لطیف ہم آہنگی پیدا کی۔اہم نکتہ یہ ہے کہ پریم چند نے معاشرے کو آشکار کرنے کے لیے ادب کو ایک بنیادی ذریعہ قرار دیا لیکن اُنھوں نے یہ مشورہ ہرگز نہیں دیا کہ ادیب اپنے بنیادی عقیدوں کو چھوڑ کر معاشرے کو توڑ پھوڑ دے۔منتشر الخیالی کو فروغ دے اور جنسی ہیجان پرور ماحول کی تخلیق کرے اُنھوں نے تو ترقی پسندوں کو توازن اور اعتدال کی راہ

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

فراہم کی۔[۴۷] مجنوں گورکھپوری ''ادب اور زندگی'' میں اِسی خیال کی تفہیم یوں کرتے ہیں کہ:

> ادب کے دو عنصر ہوتے ہیں ایک تو داخلی و انفرادی یا جمالیاتی ہے، دوسرا خارجی یا اجتماعی یا افادی ہے چوں کہ افراط و تفریط کا خطرہ زندگی کی ایک عام خصوصیت ہے اِس لیے ادب میں بھی کبھی ایک عنصر غالب رہتا ہے اور کبھی دوسرا۔ اب تک ادب میں جس کی افراط رہی ہے وہ داخلی اور جمالیاتی تھا اِسی لیے ادب کے تفریحی رُخ پر اب تک زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اب اِس کے برعکس ادب میں خارجی عنصر کا غلبہ ہو رہا ہے اور اِس کے عملی اور افادی رخ پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے لیکن کامیاب ادب وہی ہے جس میں یہ دونوں عناصر ایک مزاج ہو کر ظاہر ہوں۔[۴۸]

یہ تمام نظریات اپنی جگہ صحیح تھے لیکن جب انجمن کا منشور منظور کیا گیا تو منشی پریم چند کے اس نظریے کو نظرانداز کر دیا گیا۔ منشور کے اہم مقاصد یہ تھے کہ تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنّفین کی امداد سے مشاورتی اجلاس کا انعقاد، لٹریچر کے ذریعے مقاصد کا ابلاغ، رجعت پسند رجحانات کے خلاف آواز بلند کرنا اور تحریک آزادی کے لیے جدوجہد، آزادیٔ خیال کو تحفظ فراہم کرنا وغیرہ[۴۹] مذکورہ بالا مقاصد نے ترقی پسند ادب کے ذریعے انقلابی سوچ، فکر اور عملی جدوجہد کے ذریعے سیاست کو مکمل طور پر ادب میں داخل کر دیا اِس طرح سیاست ادب پر حاوی ہوگئی۔ جھوٹ، افلاس، جبر و تشدد، ناخواندگی اور طبقاتی کشمکش کے مسائل شعرا کے موضوعات بن گئے۔ بڑے بڑے رومانوی شعرا جام و سبو توڑ کر بندوق اور توپوں کی باتیں کرنے لگے۔

عبادالرحمٰن کُرد، میر گل خان نصیر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> میر گل خان نصیر نے بلوچ عوام کی سیاسی بیداری میں ہراوّل دستے کی رہنمائی کا فرض سرانجام دیا۔ اپنی شاعری کے ذریعے استحصالی نظام اور عوام کی بنیادی ضرورتوں کی عدم فراہمی کے خلاف محاذ قائم کیے رکھا یہی نہیں سرداروں اور نو آبادیاتی تسلط اور آمریت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کی وہ ہر مقام پر بلوچستان کی قوم کی پسماندگی کا رونا روتے رہے۔ معاشرہ سازی کے لیے اپنے افکار و نظریات کا پرچار کرتے رہے۔[۵۰]

ترقی پسند خیالات اتنے مقبول ہوئے کہ تمام اکابر شعرا ایک جھنڈے تلے منظم ہوگئے اور اِس نے ایک

ISSN: 2519-6332 (Print),   ISSN: 2708-1915 (Online)

بڑی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اِس تحریک کے علم برداروں میں جوشؔ، فراقؔ، ساحرؔ لدھیانوی، اخترالایمان، احسان دانش، مخدوم محی الدین، مجاز، ن م راشد اور ساغر صدیقی وغیرہ شامل تھے۔ یہی عہد تھا جب بلوچستان میں میر یوسف عزیز مگسی، محمد حسین عنقا اور میر گل خان نصیر وغیرہ نے ترقی پسند نظریات کے تحت قومی شعور کو عوام میں بیدار کرنا شروع کر دیا تھا۔ لہٰذا محکوم اور مظلوم عوام نے اِس انقلاب اور تبدیلی کا بڑے جوش و خروش کے ساتھ استقبال کیا۔ بلوچستان کے شعرا سوویت انقلاب اور سوشلسٹ نظریے سے تو متاثر تھے ہی اِسی لیے وہ ترقی پسند تحریک کی طرف فوراً مائل ہوگئے۔[۵۱] اس نظریے پر عنقا، گل خان نصیر اور آزاد جمالدینی اور ان کے ہم عصر شعرا شاعری کر رہے تھے تقریباً اسی طرز کی شاعری پوری دنیا میں ہو رہی تھی بس ذرا موسمی اثرات، جغرافیائی ماحول اور زبان و ثقافت نے الفاظ، ضرب المثال اور محاورے بدل دیے تھے۔ ترکی میں بالکل یہی شاعری ناظم حکمت کر رہے تھے وہی چلی میں پبلو نرودا یہی کچھ دہرا رہے تھے۔ فارس میں لاہوتی کی شاعری کے معانی و آہنگ بھی یہی تھے۔ برصغیر میں فیض، جوش، مجاز جیسی شاعری گل خان بھی کر رہے تھے۔ مقصدی، سنجیدہ جس میں احتجاج اور للکار کا پہلو نمایاں تھا۔[۵۲] اس ضمن میں ترقی پسند شاعروں کی تخلیقات کے کچھ نمونے شامل کیے جا رہے ہیں۔

جوش کی شاعری میں جوش و خروش اور انقلاب کا عنصر نمایاں ہے جیسے شکستِ زنداں کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں:

آنکھوں میں گدا کی سُرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطان کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا اُن کو خبر تھی، زیروزبر رکھتے تھے جو روحِ ملّت کو
اُبلیں گے زمیں سے مارِ سیہہ، برسیں گی فلک سے شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
کیا اُن کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اِسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں[۵۳]

اِس نظم میں دیکھیں کہ تشبیہات و استعارات کے ذریعے سے غیظ و غضب، جوش و غصہ کا اظہار ملتا ہے۔ جوش کی بہت سی نظموں کا اُسلوب، اُن کا طرز بیان اور اُن کی اِس نوع کی تشبیہوں کا بلوچستان کے شعرا پر گہرا اثر پڑا ہے۔[۵۴]

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

حریم اوستوی کی نظم ''قسمیں'' کے کچھ بند ملاحظہ کیجیے:

قسم بے چین حالت کی، قسم رنجیدہ راحت کی — قسم بے باک وحشت کی، قسم تخریبِ عزت کی
ترے قصرِ ملوکانہ کو ٹھوکر سے اُڑادوں گا — قسم ہے جوش وحدت کی، قسم ہے حُسنِ غربت کی
قسم آئینِ مِلت کی، قسم خوابیدہ ہمت کی — ترے عشرت کدے کی آج دیواریں ہلا دوں گا(۵۵)

گل خان نصیر کی نظم ''اے میرے پیارے وطن'' میں انقلاب کی کشمکش سے بھرپور زندگی مچل رہی ہے:

جانتا ہوں کہ یہاں ظلم ہے تعزیریں ہیں
بیڑیاں پاؤں میں ہیں ہاتھوں میں زنجیریں ہیں
اونچے سردار ہیں زردار ستم ڈھانے کو
اور بے چارے کماکاروں پہ شمشیریں ہیں
پر میرے پیارے وطن تجھ کو میں چھوڑوں کیسے
میں نہ چھوڑوں گا تجھے ہاتھوں میں سرداروں کے
میں نہ بھاگوں گا کہیں جاہ و حشم سے ڈر کر
تیری آغوش میں ہی مجھ کو فنا ہونا ہے
تیرے ماتھے سے مجھے داغ سیاہ دھونا ہے(۵۶)

فیضؔ جب یہ کہتے ہیں کہ:

متاعِ لوح وقلم چھن گئی تو کیا غم ہے — کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے — ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے(۵۷)

میر گل خان نصیر کی درج ذیل نظم میں فیضؔ کے اسلوب کی جھلک صاف دکھتی ہے:

میرے ہاتھوں میں امانت یہ قلم
حسن اور عشق کے قصوں کا روادار نہیں
دولت و شہرت و منصب اِسے درکار نہیں
میں کہ شاعر ہوں مگر میرا ہنر میرا سخن
اِک نئے طرز کا، آدرش کا آئینہ ہے
میرے اشعار امانت ہیں مرے لوگوں کے

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

میرا ہنسنا مرا رونا ہے انھی کی خاطر[۵۸]

ترقی پسند تحریک کا نمائندہ شاعر مجازؔ اُس کی نظم ''آوارہ'' میں اُس کی ذہنی بغاوت دیکھیے جہاں غمِ دل اور وحشتِ دل اُس کے داخلی احساسات ہیں اور وہیں سرمایہ دارانہ نظام کی جارحیت پوری طرح نظر آتی ہے:

بڑھ کے اس اندرسبھا کا سازو ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستان پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا،میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں،اے وحشتِ دل کیا کروں[۵۹]

اب اِسی اسلوب میں یوسف عزیز مگسی کے چند اشعار پر نظر ڈالتے ہیں جس میں اُن کا داخلی احساس موجود ہے:

اِس قدر شعلہ فشاں بزمِ جہاں ہوجاؤں ذرے ذرے میں بپا حشر کا ساماں کردوں
میں وہ مالی ہوں اگر کھول دوں دل کی سوتیں خشک صحراؤں میں پیدا گل و ریحاں کردوں
اُسی ایقان ِبراہیم کا وارث ہوں عزیز اب بھی آتش کو اگر چاہوں گلستاں کردوں[۶۰]

احسان دانش اپنی نظم ''اپنے شکاری دوست'' میں وہ جنگل کے درندوں کو سرمایہ داروں سے بہتر قرار دیتے ہیں:

یہ کبھی آبادیوں میں آکے غراتے نہیں یہ کسانوں اور مزدوروں کا حق کھاتے نہیں
ان سے بڑھ کر وہ درندے ہیں شقی دل گرگ خُو چوس لیتے ہیں جو مزدوروں کی شہہ رگ کا لہو
لاکھ حیواں ہوں اخوت کو یہ کھو سکتے نہیں شیر چیتے ایسے بے انصاف ہو سکتے نہیں[۶۱]

زیب مگسی کا شعر قابلِ توجہ ہے:

اہلِ ہمت ہی گرفتار بلا ہوتے ہیں
شیر زنجیر میں ہیں کتے ہیں بازاروں میں[۶۲]

بلوچ شعرا کی شاعری کے اِس مطالعے سے معلوم ہوا کہ جہاں برصغیر کے شعرا ترقی پسندی سے متاثر ہوئے وہاں بلوچستان کے شعرا نے بھی قبائلی معاشرے میں مثبت تبدیلیاں لانے اور گھٹن زدہ ماحول،طبقاتی نظام اور استحصالی نظام سے نکلنے اور زندگی کی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کے خواب دیکھنے کی ابتدا کی اور اس کی تعبیر کو پانے کے لیے پسے ہوئے طبقے کی امنگوں،آرزوؤں اور اُن کے آدرشوں کی بھرپور نمائندگی کی چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ اِس مزاحمتی،فکری و نظریاتی تحریک نے علمی،ادبی،لسانی اور سماجی سطح پر وہ مثبت تبدیلیاں پیدا کیں جس نے تحریکِ پاکستان کی راہ ہموار کی میر حسن براہوی نے اُردو شاعری کا جو بیج بلوچستان کی سنگلاخ سرزمین میں بویا

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

تھا۔ وہ بیسویں صدی کی پانچ دہائیوں تک پھلتا پھولتا رہا اور قیامِ پاکستان کے بعد ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُردو شاعری کے اِس ارتقائی سفر نے مستعار تصورات سے الگ ہو کر ''دبستانِ بلوچستان'' کی صورت میں اپنی ایک علیحدہ شناخت قائم کی اور بلوچستان میں نئی شاعری کا دور شروع ہوا۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ''ادب وفن''، (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۹۹
۲۔ ایضاً
۳۔ انور سدید، ''اردو ادب کی تحریکیں''، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۰ء)، ص ۵۰۔۴۹
۴۔ ڈاکٹر آغا محمد ناصر، ''بلوچستان میں اردو شاعری کا مستقبل اور امکانات''، مشمولہ ''اخبارِ اردو''، شمارہ ۲، فروری ۲۰۱۳ء، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان)، ص ۱۳
۵۔ انور سدید، ''اردو ادب کی تحریکیں''، ص ۴۲۰
۶۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ''ادب وفن''، ص ۲۰۳
۷۔ ایضاً، ''سرسیّد احمد خان اور اُن کے رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ''، (لاہور: مکتبۂ کارواں، ۱۹۶۵ء)، ص ۵۹
۸۔ انور سدید، ''اردو ادب کی تحریکیں''، ص ۳۱۷
۹۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ''سرسیّد احمد خان اور اُن کے رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ''، ص ۱۹۰
۱۰۔ انور سدید، ''اردو ادب کی تحریکیں''، ص ۳۱۸
۱۱۔ محمد اسماعیل پانی پتی (مرتب)، ''مقالاتِ سرسید''، جلد ۴، (لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب ۱۹۶۵ء)، ص ۱۱۴
۱۲۔ انور سدید، ''اردو ادب کی تحریکیں''، ص ۳۱۹
۱۳۔ ایضاً
۱۴۔ محمد اسماعیل پانی پتی (مرتب)، ''مقالاتِ سرسید''، ص ۱۲۰
۱۵۔ انور سدید، ''اردو ادب کی مختصر تاریخ''، (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۸ء)، ص ۳۱۵
۱۶۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر، ''بلوچستان میں اردو''، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۰۷
۱۷۔ ایضاً، ص ۱۰۹
۱۸۔ ایضاً، ص ۱۱۰
۱۹۔ ڈاکٹر آغا محمد ناصر، ''بلوچستان میں اردو شاعری کا مستقبل اور امکانات''، ص ۱۹۰
۲۰۔ انور سدید، ''اردو ادب کی تحریکیں''، ص ۴۲۴
۲۱۔ ایضاً، ''اردو ادب کی مختصر تاریخ''، ص ۴۲۵
۲۲۔ سیّد عبداللہ، ''ادب وفن''، ص ۲۰۵۔۲۰۴
۲۳۔ پروفیسر فتح محمد ملک و دیگر (مرتبین)، ''پاکستان میں اردو''، (جلد دوم۔ بلوچستان)، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۶ء)، ص ۳۹۶

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

۲۴۔ ایضاً،ص۳۹۶

۲۵۔ آغا محمد ناصر، ڈاکٹر، مقالہ ''بلوچستان میں اردو شاعری کا سیاسی و سماجی مطالعہ''، (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ) مخزونہ جامعہ کراچی، ص۱۱۹

۲۶۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر، ''بلوچستان میں اردو''، ص ۱۴۴

۲۷۔ ایضاً، ص۱۴۵

۲۸۔ ڈاکٹر آغا محمد ناصر، ''بلوچستان میں اردو شاعری کا سیاسی و سماجی مطالعہ''، ص۱۱۹

۲۹۔ پروفیسر فتح محمد ملک و دیگر (مرتبین)، ''پاکستان میں اردو''، (جلد دوم۔بلوچستان)، ص۴۰۔۳۹

۳۰۔ ایضاً، ص ۴۴۔۴۳

۳۱۔ علامہ اقبال، ''کلیاتِ اقبال''، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، سنہ ندارد)، ص ۱۴۷

۳۲۔ ڈاکٹر مبارک علی، ''تاریخ کے بدلتے ہوئے نظریات''، (لاہور: تاریخ پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۴۸۔۱۴۷

۳۳۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر، ''بلوچستان میں اردو''، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء)، ص ۱۲۱، طبع دوم

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۳۵۔ روزنامہ ''زمیندار''، لاہور، بتاریخ، ۲۲/اپریل ۱۹۳۴ء، بحوالہ ''بلوچستان میں اردو''، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء)، ص ۱۲۳، طبع دوم

۳۶۔ اختر علی خان بلوچ، ''بلوچستان کی نامور شخصیات''، جلد دوم، (کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۹۵ء)، ص۲۱

۳۷۔ عزیز احمد، ''ترقی پسند ادب''، مرتبہ ڈاکٹر ابو خالد صدیقی، (کراچی: عصری مطبوعات، ۱۹۹۹ء)، ص ۵۵

۳۸۔ علامہ اقبال، ''بالِ جبریل''، (لاہور: پاکستان ٹائمز پریس، دسمبر ۱۹۷۷ء)، ص ۹۴، طبع یازدہم

۳۹۔ ایضاً، ص۱۴۹

۴۰۔ ڈاکٹر آغا محمد ناصر، ''بلوچستان میں اردو شاعری کا سماجی و سیاسی مطالعہ''، ص ۱۸۲

۴۱۔ نور محمد شیخ (مرتب)، ''میر گل خان نصیر: شخصیت، شاعری اور سیاست''، (کراچی: عوامی ادبی انجمن، ۱۹۹۳ء)، ص۶۹

۴۲۔ میر گل خان نصیر، ''گرنَد''، (مستونگ: قلات پبلشرز، ۱۹۷۱ء)، ص۱۷۔۱۵

۴۳۔ نور محمد شیخ (مرتب)، ''میر گل خان نصیر: شخصیت، شاعری اور سیاست''، ص۶۹

۴۴۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ''ادب و فن''، (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء)، ص ۲۶۴۔۲۶۳

۴۵۔ شمیم حنفی، ''تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ''، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء)، ص ۳۱۰

۴۶۔ انور سدید، ''اردو ادب کی تحریکیں''، ص ۷۷۴۔۷۶۴

۴۷۔ ایضاً، ص ۷۷۴

۴۸۔ مجنوں گورکھ پوری، ''ادب اور زندگی''، (کراچی: مکتبۂ دانیال، ۱۹۸۷ء)، ص۹۷

۴۹۔ انور سدید، ''اردو ادب کی تحریکیں''، ص ۸۷۴

۵۰۔ عبدالرحمٰن کرد، ''ہراول سیاسی دستے کے رہنما''، مشمولہ ''بلوچی دنیا''، ملتان، میر گل خان نصیر نمبر، ۱۹۸۴ء، ص ۵۰۔۴۹

۵۱۔ واجد بزدار، ''بلوچی شاعری پر ترقی پسند تحریک کے اثرات'' مشمولہ ''پاکستان میں اردو'' (جلد دوم۔بلوچستان)، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء)، ص ۳۹۷، طبع دوم

۵۲۔ شاہ محمد مری، ''میر گل خان نصیر کی شاعری کا طرز اور موضوعات''، مشمولہ ''ادبیات''، شمارہ ۹۱۔۹۰، جنوری تا جون ۲۰۱۱ء، (اسلام آباد،

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

اکادمی ادبیات پاکستان)،ص۱۵۸

۵۳۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی، ''جوش کی تیرہ نظمیں''، (اورنگ آباد: سویرا آفسٹ پرنٹرس، ۲۰۰۳ء)،ص۱۸

۵۴۔ عزیز احمد، ''ترقی پسند ادب''، (کراچی: عصری مطبوعات، ۱۹۸۶ء)،ص۶۷-۶۶

۵۵۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر، ''بلوچستان میں اردو''، (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء)،ص۲۲۹،طبع دوم

۵۶۔ ڈاکٹر آغا محمد ناصر، ''بلوچستان میں اردو شاعری کا سماجی و سیاسی مطالعہ''،ص۱۹۲

۵۷۔ فیض احمد فیضؔ، کلیات، ''نسخہ ہائے وفا''، (لاہور: مکتبۂ کارواں، س ن)،ص۱۰۷

۵۸۔ شاہ محمد مری، ''میر گل خان نصیر کی شاعری کا طرز اور موضوعات''،ص۱۵۹

۵۹۔ مجاز لکھنوی، ''آہنگ''، (کراچی: مکتبۂ ممتاز، ۱۹۵۵ء)،ص ۹۳

۶۰۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر ''بلوچستان میں اردو''،ص۱۱۷-۱۱۶

۶۱۔ عزیز احمد، ''ترقی پسند ادب''،ص۸۱

۶۲۔ ڈاکٹر آغا محمد ناصر، ''بلوچستان میں اردو شاعری کا سماجی و سیاسی مطالعہ''،ص ۱۴۳

ماٰخذ

۱۔ احمد، عزیز، ''ترقی پسند ادب''، کراچی: عصری مطبوعات، ۱۹۸۶ء

۲۔ ______، ______، مرتبہ ڈاکٹر ابو خالد صدیقی، کراچی: عصری مطبوعات، ۱۹۹۹ء

۳۔ اقبال، علامہ، ''کلیاتِ اقبال''، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، سنہ ندارد

۴۔ ______، ''بالِ جبریل''، لاہور: پاکستان ٹائمز پریس، دسمبر ۱۹۷۷ء، طبع یازدہم

۵۔ بزدار، واحد، ''بلوچی شاعری پر ترقی پسند تحریک کے اثرات'' مشمولہ ''پاکستان میں اردو'' (جلد دوم۔بلوچستان)، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء، طبع دوم

۶۔ بلوچ، اختر علی خان، ''بلوچستان کی نامور شخصیات''، جلد دوم، کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۹۵ء

۷۔ پانی پتی، محمد اسماعیل (مرتب)، ''مقالاتِ سرسید''، جلد ۴، لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب ۱۹۶۵ء

۸۔ حنفی، شمیم، ''تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ''، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء

۹۔ سدید، انور، ''اردو ادب کی تحریکیں''، کراچی: انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، ۲۰۱۰ء

۱۰۔ ______، ''اردو ادب کی مختصر تاریخ''، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۸ء

۱۱۔ شیخ، نور محمد (مرتب)، ''میر گل خان نصیر: شخصیت، شاعری اور سیاست''، کراچی: عوامی ادبی انجمن، ۱۹۹۳ء

۱۲۔ صدیقی، ضیاء الرحمٰن، ڈاکٹر، ''جوش کی تیرہ نظمیں''، اورنگ آباد: سویرا آفسٹ پرنٹرس، ۲۰۰۳ء

۱۳۔ عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، ''ادب و فن''، لاہور: اُردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء

۱۴۔ ایضاً، ''سرسیّد احمد خان اور اُن کے رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ''، لاہور: مکتبۂ کارواں، ۱۹۶۵ء

۱۵۔ علی، مبارک، ڈاکٹر، ''تاریخ کے بدلتے ہوئے نظریات''، لاہور: تاریخ پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء

۱۶۔ فیضؔ، فیض احمد، کلیات، ''نسخہ ہائے وفا''، لاہور: مکتبۂ کارواں، س ن

ISSN: 2519-6332 (Print),   ISSN: 2708-1915 (Online)

۱۷۔ کوثر، انعام الحق، ڈاکٹر، ''بلوچستان میں اردو''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء
۱۸۔ ______، ______، ______، ۱۹۹۴ء، طبع دوم
۱۹۔ گورکھ پوری، مجنوں، ''ادب اور زندگی''، کراچی: مکتبۂ دانیال، ۱۹۸۷ء
۲۰۔ لکھنوی، مجازؔ، ''آہنگ''، کراچی: مکتبۂ ممتاز، ۱۹۵۵ء
۲۱۔ ملک، فتح محمد، پروفیسر و دیگر (مرتبین)، ''پاکستان میں اردو''، (جلد دوم۔بلوچستان)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۶ء
۲۲۔ نصیر، میر گل خان، ''گرئند''، مستونگ: قلات پبلشرز، ۱۹۷۱ء

اخبار و رسائل

۱۔ ماہ نامہ ''اخبارِ اردو''، اسلام آباد، شمارہ ۲، فروری ۲۰۱۳ء
۲۔ ''ادبیات''، شمارہ ۹۱۔۹۰، جنوری تا جون ۲۰۱۱ء، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان
۳۔ ماہ نامہ ''بلوچی دنیا''، ملتان، میر گل خان نصیر نمبر، ۱۹۸۴ء
۴۔ روزنامہ ''زمیندار''، لاہور، بتاریخ ۲۲/اپریل ۱۹۳۴

غیر مطبوعہ

۱۔ ناصر، آغا محمد، ڈاکٹر، مقالہ ''بلوچستان میں اردو شاعری کا سیاسی و سماجی مطالعہ''، (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ)، مخزونہ جامعہ کراچی